مولانا محمد فاروق خاں

حسّاس نگاہی اور علامہ فراہیؒ

اصولِ تفسیر کے موضوع پر علماء نے جو کتابیں لکھی اُن میں قرآن فہمی کے لازمی شرائط کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً صرف ونحو کا علم، عربی زبان کا صحیح ذوق، کلام عرب پر نظر، ناسخ ومنسوخ آیات کا علم، شانِ نزول کی اطلاع، نظائر پر نگاہ، احادیث صحیحہ پر نظر، ایّام جاہلیت کی تاریخ کا علم، عرب جاہلیت کے عقائد و رسوم کا علم، کتب سابقہ اور اہلِ کتاب کی تاریخ پر نظر، فلسفہ ومنطق میں رسوخ، فکر وتدبّر، نیت کی پاکیزگی اور کلام الٰہی کی عظمت کا احساس وغیرہ۔

پھر بعض نے جن میں علامہ حمید الدین فراہیؒ کی شخصیت ممتاز ہے، اس سلسلہ میں اس کو بھی قرآن فہمی کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ مفسر کو نہ صرف یہ کہ قرآن کے مربوط ومنظم کلام ہونے کا یقین حاصل ہو بلکہ قرآن حکیم کے نظم پر اس کی گہری نظر بھی ہو۔ اس سے صرف یہی نہیں کہ قرآن کی آیات کا صحیح مفہوم متعین ہو سکے گا بلکہ نظم کلام کے ذریعہ سے بہت سارے وہ اختلافات بھی ختم ہو جائیں گے جن کا رفع ہونا عام نگاہ میں مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا ہے۔

مجدد الف ثانیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں فہم قرآن کے لیے ایک بنیادی شرط یہ بیان فرمائی ہے کہ آدمی کو اپنی علمیت کا نہیں بلکہ اپنی بے خبری کا شدید احساس ہونا چاہیے۔ وہ قرآن کا مطالعہ اس احساس کے ساتھ کرے کہ اسے کچھ بھی علم نہیں ہے۔ وہ حصولِ علم کے لیے کلام الٰہی کی رہ نمائی کا محتاج ہے' اس احساس کے بغیر اگر کوئی قرآن پڑھتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے' قرآن میں وہ اپنے ہی افکار وخیالات کی تلاش وجستجو میں مصروف ہو جائے اور قرآن کے معارف اور اس کے اعلیٰ مفاہیم سے وہ ناآشنا کا ناآشنا ہی رہ جائے اور اس کی تغیر' تفسیر بالرائے قرار پائے اور وہ اہلِ حق کی نگاہ میں معانی قرآن کی تحریف کا مرتکب ٹھہرے۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر کوئی صحیح معنی میں قرآن کو

سمجھنا چاہتا ہے تو اُسے مطالعہ کے کمرے سے باہر نکل کر لوگوں کو قرآن کی دعوت دینی ہوگی پھر آج کے دَور میں بھی اس کو وہ سارے مراحل پیش آئیں گے جن کا ذکر قرآن میں ملتا ہے۔ دعوت کی راہ میں اس کو لوگوں کی طرف سے اسی طرح کے ردِّعمل سے سابقہ پیش آئے گا جس قسم کے ردِّعمل سے اہلِ حق کو صدرِ اول میں سابقہ پیش آچکا ہے جس کی تفصیلات ہمیں قرآن میں ملتی ہیں، اس طرح قرآن کی آیتوں کا صحیح مفہوم و مصداق کا علم ہمیں بآسانی حاصل ہوگا۔

علامہ حمید الدین فراہیؒ نے فہمِ قرآن کے اصولوں اور شرائط میں سے تقریباً سبھی کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا ہے اور اس سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ قرآنی مشکلات کو حل کرنے کی علامہ کی کوشش ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا اعتراف ہر صاحبِ نظر اور انصاف پسند شخص کرے گا۔ علامہ فراہیؒ نے لوگوں کو قرآن کی عظمت سے واقف کرانے کی جو سعی بلیغ کی ہے وہ تفاسیرِ قرآن کی تاریخ میں ایک منفرد اور عظیم کارنامہ ہے۔ لیکن علامہ کی کاوش کی قدر و قیمت کو صحیح معنی میں وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو اعلیٰ ذہن رکھتا ہو اور ہر قسم کی عصبیتوں سے پاک ہو جس کی نگاہ بلند اور جس کا قلب وسیع ہو۔ کم ظرف اور بے حوصلہ قسم کے لوگ علامہؒ کی عظمت کو سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہیں گے۔

علامہ فراہیؒ کو خدا نے بہت سی خوبیوں اور اوصاف سے نوازا تھا۔ ہم یہاں ان کی صرف اس ایک خوبی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ حد درجہ حسّاس واقع ہوئے تھے۔ وہ لطیف اور پاکیزہ ذوق کے حامل تھے۔ ان کی حیثیت ایک ایسے حسّاس آلہ کی تھی جو فضا کی ہلکی سے ہلکی جنبش اور ہلکی سے ہلکی تھرتھراہٹ کو بھی ریکارڈ کر لیتا ہو۔ علامہؒ کے اس وصف خاص نے اُن پر قرآن کے بعض ایسے گوشے کھولے ہیں جو عام طور پر نگاہوں سے اوجھل ہی رہے ہیں۔ علامہ نے اپنے اس وصف کی بدولت بعض ان دینی حقائق کو سمجھنے میں کامیابی حاصل کی ہے جن کو سمجھنے میں بڑے سے بڑے علماء ناکام دکھائی دیتے ہیں۔

علامہؒ کے اس امتیازی وصف نے ان کو ہر قسم کی سطحیت اور سستے ذوق سے دور رکھا۔ وہ نہ تو کسی سطحی قسم کے علم پر قانع ہو سکتے تھے اور نہ سستے اور ارزاں قسم کا ذوق و احساس انھیں تسکین ہی بخش سکتا تھا۔ ان کی حسّاس طبیعت اور حسّاس نگاہی کا اندازہ ہم کو ان کی تحریروں سے

بخوبی ہوتا ہے جو انھوں نے قرآنی آیات کے معارف و معانی کی وضاحت میں رقم فرمائی ہیں۔ ہم یہاں بطورِ مثال علامہ کی کچھ ایسی تحقیقات اور تفسیری آرار کو پیش کرنا چاہیں گے جس سے ہمارا مدّعا واضح ہو سکے گا۔

یہاں اس بات کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے سامنے پہلے سے کوئی ایسی متعین راہ نہ تھی جس پر وہ اطمینان کے ساتھ اپنا سفر شروع کر سکتے، انھیں اپنی راہ خود نکالنی پڑی۔ اس کام میں عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصہ صرف ہوگیا ــ اور پھر زندگی نے انھیں جتنا بھی موقع دیا وہ اُسی پر چلتے رہے۔

باطنی سوز و گداز کی بدولت علامہ دین کی اصل روح اور اس کی اسپرٹ کو بآسانی سمجھ گئے۔ اور وہ یہ بات پورے وثوق سے کہنے کی پوزیشن میں تھے کہ دین کی حقیقت محبت، گداز باطنی اور لطافتِ احساس ہے۔ خدا کوئی بے حس ذات نہیں ہے۔ اس کے یہاں رحمت کو اوّلیت اور فوقیت حاصل ہے۔ دین کی حقیقت محبت اور لطافتِ احساس ہے۔ علامہ نے سورہ الانعام کی آیت "قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ" (ابراہیمؑ نے کہا: میں ڈوب جانے والوں سے محبت نہیں کرتا) سے استشہاد فرمایا ہے کہ دینِ ابراہیمی اور عبادتِ ابراہیمی کی بنا محبت ہے جب کہ مشرکین کی عبادت کا اصل محرک خوف ہے۔ اس سے دینِ ابراہیمی کا بنیادی امتیاز کُھل کر سامنے آتا ہے۔ علامہ کے الفاظ ہیں:

مَبنیٰ عبادۃِ ابراھیمَ المحبّۃُ ومَبنیٰ عبادۃِ المشرکینَ الخوفُ۔

دین میں اصلاً مطلوب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا عکس اس کے بندوں میں دکھائی دے۔ اس لیے لازماً دین اپنی روح کے لحاظ سے سراپا لطافتِ احساس ہی ہوگا۔ اس لیے اس دین اور خدا کے عطا کردہ دینی نظام میں خدا ہی کی صفات کے جلووں کو دیکھنے کی طمع ہونی چاہیے، نہ کہ اس کے سوا کچھ اور دیکھنے کی خواہش کو ہم اپنے اندر جگہ دیتے رہیں۔ بقول علامہؒ جس کو خدا کی نظر نوازتی ہے اس کا سینہ انوار و تجلّیاتِ الٰہی سے جگمگا اٹھتا ہے اور ہماری فطرت میں جو کچھ ودیعت ہے اُس کو اُبھرنے اور نمایاں ہونے کا موقع میسّر آتا ہے۔ اس اعتبار سے دین علامہ کے اپنے لفظوں میں سیرِ باطن ہے۔ سیرِ باطن میں ظاہری آنکھ سے زیادہ

قوتِ فکر یہ سے کام لینا ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں تفکر و تدبر کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

جس دین اور طریقِ حیات میں یہ خوبی نہ ہو کہ وہ ہمارے ذوق و شوق اور اضطرابِ قلب کا صحیح معنی میں تقاضا بن سکے اُسے ایک زندہ اور حیات بخش دین نہیں کہا سکتا۔ علامہ کے نزدیک ہمارے نفوس کے اندر خدا کے لیے ایک فطری شوق و رغبت موجود ہے، اس ذوق و رغبت کی تسکین کا سامان اگر فراہم نہ ہو تو نفسِ انسانی تسکین نہیں پا سکتا۔ علامہ لکھتے ہیں:

"انسان کی یہی فطرت مذاہب و ادیان کے وجود کا باعث ہوئی ہے۔ اسی اشتیاق و بے قراری کا یہ نتیجہ ہے کہ تم دنیا کی کسی قوم کو بھی مذہب سے خالی نہیں پاتے۔"

معلوم ہوا کہ اشتیاق اور ایک قسم کی بے قراری سے ہمارے قلوب خالی ہوں تو ہم دین اور قرآن کی تعلیمات کو صحیح رُخ سے نہیں دیکھ سکتے، اور دین کے حامل ہونے کے باوجود دین حقیقت میں ہماری زندگی نہیں بن سکتا۔

علامہؒ نے قرآن کی آیات سے جو لطیف استدلال و استشہاد کیے ہیں وہ محض ان کے علم اور وسعتِ مطالعہ اور صرف ان کے تدبر کا نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتے بلکہ اس سلسلہ میں رہ نما ان کی حساس فطرت بھی رہی ہے۔ اب ہم یہاں اپنے دعوی کے ثبوت میں ان کے کچھ استشہاد و استدلال کا تذکرہ کریں گے۔

پہلی مثال

سورہ الذٰریٰت میں باطل کوشش اہلِ کفر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "وہ غفلت کی بے ہوشی میں پڑے ہوئے ہیں" (اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ)۔ پھر اہلِ کفر کے بعد اہلِ ایمان کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ان کا ذکر "مُتّقین" کے لقب سے کیا گیا ہے۔ تقابل کے اصول کے تحت یہ بات بغیر کہے ہی واضح ہو جاتی ہے کہ "مُتّقین" وہ ہیں جو غافل اور مدہوش نہ ہوں۔ یہ بات کہی نہیں گئی مگر بغیر کہے ظاہر ہو رہی ہے۔ علامہؒ اس چیز کو ایجازِ کلام کی خوبی بتاتے

ہیں۔ متقین کے بارے میں جس قدر بات کہی گئی ہے اس سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ یہ غفلت کی نیند سونے والے لوگ نہیں ہیں، بلکہ بیدار لوگ ہیں اور ان کی یہ بیداری ان کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ عالمِ آخرت میں ان ہی کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ راتوں کو تھوڑا ہی سوتے تھے، اوقاتِ سحر میں مغفرت مانگتے تھے، اور ان کے اموال میں سائل اور بے زبان محتاج کا حق تھا۔ مطلب یہ کہ ان کی ہوشمندی اور بیداری کردار کے ہر گوشہ میں نمایاں رہی ہے۔ علامہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"اہلِ ایمان کے سامنے روزِ جزا کے متعلق یقین و بصیرت کی پوری روشنی موجود ہے، اور وہ اس دن کے انتظار میں برابر جاگ رہے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ یہ سارا مضمون صرف ایک لفظ "متقین" سے سامنے آگیا۔" (تفسیر سورۂ ذاریات، ص ۲۰۵)

علامہ کے نزدیک لفظ "متقین" کا یہ استعمال اسے ظاہر و باطن دونوں ہی پہلوؤں سے حد درجہ وسعت بخش دیتا ہے، اور اس کے اس وسیع مفہوم کی تصدیق قرآن کی دوسری بہت سی آیتیں بھی کرتی ہیں۔

دوسری مثال

ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ سورہ العنکبوت (آیت ۶۴-۶۹) میں ہے:

"اور یہ دنیا کی زندگی تو بس دل کا بہلاوا اور کھیل ہے، رہا دارِ آخرت تو زندگی تو بس وہی ہے۔ کاش وہ جانتے۔ جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اللہ کو دین کو اس کے لیے خالص کر کے پکارتے ہیں، لیکن جب وہ انھیں بچا کر خشکی تک لے آتا ہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ لگے شرک کرنے تا کہ جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس طرح وہ اُس کی ناشکری کریں اور تا کہ اس طرح مزے لوٹیں۔ اچھا تو وہ جلد ہی جان لیں گے۔ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ایک پُرامن حرم بنایا، حالانکہ ان کے آس پاس سے لوگ اُچک لیے جاتے ہیں؟ کیا پھر بھی وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں؟ اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اُس کے پاس آچکا ہو؟ کیا کافروں کا ٹھکانا جہنم نہ ہوگا؟

رہے وہ لوگ جنھوں نے ہماری خاطر مجاہدہ کیا، انھیں ہم لازماً اپنی راہیں دکھائیں گے، بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔"

علامہؒ کے نزدیک اہلِ باطل یا اہلِ کفر دنیا کی حیاتِ چند روزہ میں اس قدر منہمک ہیں کہ وہ حیاتِ خالدہ کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ ان کے مشاغل کے پیچھے صرف خواہشاتِ نفس اور شہوات کی کارفرمائی ہے۔ لیکن بالآخر حقیقت ظاہر ہو کر رہے گی۔ قرآن نے کشتی میں سوار ہونے اور طوفان میں اس کے گھر جانے کو بطورِ تمثیل پیش کیا ہے۔ علامہؒ نے اس کے بعد جو بات کہی ہے وہ وہی شخص کہہ سکتا ہے جو حد درجہ حسّاس اور بیدار مغز ہو۔ علامہؒ لکھتے ہیں:

"وفیہ اشارۃٌ الی أنّ الانسان فی ھٰذہ الحیاۃ بین امواج الشھوات والمصائب والمتوکل علیٰ ربّہٖ کمن ھو فی سفینۃٍ متینۃٍ۔"

اللہ نے اس سلسلہ میں پُرامن حرم کا ذکر فرمایا، یہ ذکر بہت بامعنی ہے۔ علامہؒ لکھتے ہیں:

"ولا یخفیٰ ان بیتَ اللہ ومکّۃَ مثال سفینۃٍ ظاھرۃٍ حفظھا وحقیقتھا التوحید ولکنّھم جعلوا لربّھم المحافظ شرکاء فابطلوا تلک النعمۃ ومن ادخل فی دینِ ابراھیم ھو التوحید، الشرک فقد ظلم ظُلماً عظیماً۔"

یہ سفینہ اہلِ حق کو جس کنارے لگائے گا وہ جنّت ہے اور خدا کی ان نعمت کے ناقدروں کے لیے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ جہنم میں گر کر رہیں گے۔ میں نے اختصار سے کام لیا ہے۔ علامہ کی اصل تحریر میں اسے مفصّل دیکھا جا سکتا ہے۔

علامہؒ نے جس حقیقت کا یہاں اظہار فرمایا ہے اس کی طرف نظمِ کلام سے اسی وقت رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے جب کہ قاری بے حس نہ ہو بلکہ وہ حد درجہ حسّاس ہو کہ قرآن کے لطیف تر اشاروں کو فوراً بآسانی سمجھ سکتا ہو۔

تیسری مثال

سورہ القیامہ میں نفس لوّامہ (نفس ملامت گر) کو قرآن نے یوم الحساب کی دلیل میں

پیش کیا ہے۔ علامہ اس سلسلہ میں جن نکاتِ قرآنی کو سامنے لاتے ہیں وہ ان ہی کا حصّہ ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جس طرح ہر انسان کے اندر اس کے افعال بد پر ملامت کرنے کے لیے ایک نفسِ لوّامہ (ایک ٹوکنے والا الضمیر) ہوتا ہے اسی طرح اس عالم کے احوال و معاملات پر ملامت کرنے کے لیے بھی ایک نفسِ لوّامہ ہے، اور یہی نفس لوّامہ ہے جس میں اس عالم کی صلاح و فلاح کی تمام روح پوشیدہ ہے۔ علامہ نے یہاں دراصل تاریخی حقائق و انقلاباتِ زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس اخلاقی قانون کی جانب توجہ دلائی ہے جسے تاریخ انسانی کے پیچھے کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ پھر یہی قانون ہے جس کو فطرتِ کائنات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی کے تحت موسم بدلتے ہیں، قحط کی خشکی کے بعد ابرِ باراں کی کرم فرمائیاں ہمارے مشاہدہ میں آتی ہیں۔

نفسِ لوّامہ جس قانون کے تحت وجود میں لایا گیا ہے وہ ایک ہمہ گیر قانون ہے۔ علامہ کی نگاہ کو داد دیں وہ فرماتے ہیں کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کے لیے بمنزلہ نفس لوّامہ کے ہوتا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام بنی آدم کے لیے نفس لوّامہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور پھر اسی قانون ہمہ گیر کا ظہور آخرت میں ہو گا۔ علامہ فرماتے ہیں:

"قیامت اس کائنات کے نفسِ کُلّی کے لیے بمنزلہ نفس لوامہ کے ہے۔ قیامت نفسِ کُلّی کے لیے لوّامہ ہے، یعنی جو کچھ اس نے کیا وہ سب ایک روز اس کے سامنے رکھ دے گی۔ (یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ)"

(تفسیر سورہ ذاریات)

ایک اور مثال

سورہ الذٰریٰت میں نطق انسانی سے معاد پر استدلال کیا گیا ہے، اور یہ کہا گیا ہے کہ تمھارا موت کے بعد اُٹھایا جانا اور اپنے اعمال نیک و بد کا بدلہ پانا بالکل حق ہے۔ یہ ویسا ہی واقعی ہے جیسا کہ تم بولتے ہو اور اس میں تمھیں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ اس آیت پر بھی علامہ نے بہت ہی لطیف گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ نطق کو کس طرح معاد پر ایک واضح اور محسوس دلیل کی حیثیت حاصل ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نفس کے جتنے مظاہر ہیں ان میں سب سے زیادہ قابلِ یقین نطق ہی ہے انسانی فکر اور نطق کے درمیان کوئی اور واسطہ نہیں ہے، بلکہ حقیقی نطق فکر ہی ہے۔ کانوں سے سُنا جانے والا

نطق بقول علامہؒ نطق حقیقی کا ظہور محض ہوتا ہے، پھر زبان جو کچھ کہتی ہے کان اُسے سُنتا بھی ہے، ورنہ کہنے کا منشا ہی کیا ہوگا۔ علامہؒ کی ژرف نگاہی ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

"قرآن سے ثابت ہے کہ یہ تمام کائنات خدا کے نطق سے وجود میں آئی ہے، وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے لیے کسی سامان اور آلہ کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ کلمۂ کُنْ سے اس کو پیدا فرما دیتا ہے۔ قرآن میں ہے: "اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ، فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔ (یٰسٓ ۸۱-۸۳) — (اس کا معاملہ تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا، اور وہ ہو جاتی ہے۔ پس شان و عظمت ہے اس کی جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے اور اس کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے۔)" (تفسیر سورہ ذاریات، ص ۵۲-۵۳)

کلمۂ کُنْ کی کرشمہ سازی کے بعد یہ "اس کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے" کی بات بہت بامعنی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ پیدا کرے اور تمام مخلوق اس کی طرف نہ لوٹے؟ کیا وہ بولے گا اور سُنے گا نہیں؟ پیدا کرے گا اور دیکھے گا نہیں؟" (تفسیر سورہ ذاریات ص ۵۴)

وہ فرماتے ہیں:

"نطق کی ایک لازمی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ناطق کی طرف لوٹتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ناطق بہرا ہے اور جو بہرا ہوگا وہ گونگا بھی ہوگا۔ پھر وہ ناطق کیونکر ہو سکتا ہے؟۔ نطق کی اس حقیقت کے لحاظ سے ضروری ہوا کہ تمام مخلوق اپنے خالق کی طرف لوٹے۔ کیونکہ یہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے کلمہ سے وجود میں آئی اور اسی کے حکم سے قائم ہے۔ ممکن نہیں کہ اس کے اختیار و تصرف سے باہر نکل سکے۔" (تفسیر سورہ ذاریات، ص ۵۵-۵۶)

دیکھیے علامہؒ کی حسّاس نگاہ نے قرآن کے بیان کی گہرائیوں کو کس طرح محسوس کیا اور ان کو کس طرح دل نشیں انداز میں بیان فرمایا۔ جو کچھ سمجھا مزید اطمینان کے لیے قرآن ہی سے اس

کی تصدیق بھی چاہی۔ دل نے قرآن کے کسی بیان سے جو محسوس کیا ہو اور ذہن نے اس سے جو کچھ اخذ کیا ہو اس پر مزید اطمینان کے حصول کی غرض سے یا دوسروں کے اطمینان کے لیے قرآن حکیم ہی کی طرف رجوع کرنا مناسب بھی ہے۔ قرآن کے شواہد سے اگر قرآن کے کسی بیان کی وضاحت ہوتی ہو تو پھر اطمینان اور وثوق کے لیے کسی دوسری چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دینی اصطلاحات

سورہ الاعراف کی ایک آیت کے ذیل میں علامہ نے ایک اہم نکتہ کی وضاحت فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ان الصلوٰۃ ھی الاصلُ للتقرب وھی المرکز وروحھا التوحید ومرکز الصلوٰۃِ السجدۃُ۔ فالسجدۃ تُزیل الکِبر الذی ھو المانع عن الشکر الذی ھو باب الایمان۔"

(نماز تقرّبِ الٰہی کی اصل ہے اور اس کو دین میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، روح اس کی توحید ہے اور خود نماز میں مرکزی حیثیت سجدہ کو حاصل ہے[1]۔ پھر سجدہ کبر کو مٹاتا ہے۔ شکر کی طرف بڑھنے میں کبر ایک بڑی رکاوٹ ہے، جب کہ شکر ہی ایمان کی اصل بنیاد ہے۔ جذبۂ شکر ہی سے ایمان کا باب وا ہوتا ہے۔)"

حاصل یہ ہے کہ نماز کی انتہا سجدہ ہے۔ سجدہ قربِ خداوندی کی سچّی تصویر ہے۔ سجدہ کسی کے اندر کبر کی بیماری کو باقی نہیں رہنے دے سکتا۔ متکبّر شخص شکر گزار ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی اُس نفسیاتی کیفیت سے یکسر خالی ہوگی جو ایمان کا اصل محرک اور اس کی اصل بنیاد ہے۔

نماز کی حقیقت کے سلسلہ میں علامہ نے بہت بیش قیمت باتیں بیان فرمائی ہیں، مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف بڑھنا اور اس میں داخل ہو جانا۔ پھر ان کے

---

[1] قرآن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

نزدیک نماز کی سب سے نمایاں حقیقت توجہ الی اللہ ہے۔ جو شخص نماز میں ہے وہ گویا اپنے رب کے حضور کھڑا ہے اور اس سے مناجات و گفتگو کر رہا ہے۔

حج میں میدان عرفات کا اجتماع علامہ کے نزدیک میدان حشر میں ہمارے کھڑے ہونے کی بھی ایک تصویر ہے۔ اس پہلو سے نماز، حج، قربانی کو معاد سے قریبی نسبت ہے۔

حجر اسود کو ہاتھ لگانا عہد بندگی کی تجدید و توثیق ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے اس کے بارے میں جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ بالعموم حد درجہ مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔

ان سارے حقائق کا انکشاف درحقیقت علامہ پر قرآن ہی کے مطالعہ سے ہوا ہے، لیکن انھوں نے یہ مطالعہ نہایت حساس نگاہی کے ساتھ کیا ہے جس کی وجہ سے وہ ان حقائق کو سمجھنے میں کامیاب ہو سکے جن حقائق کو سمجھنے سے بالعموم لوگ قاصر رہے ہیں۔

کلمات جامعہ

سورہ الاعراف کی ایک آیت ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰىٓ اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (الاعراف: ۲۰۳)

"کہہ دو: میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یہ ہمارے رب کی طرف سے روشن دلیلیں ہیں اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔"

اس آیت میں بصائر، ھدی اور رحمۃ تین لفظ ایک خاص ترتیب سے آئے ہیں۔ علامہؒ نے لکھا ہے کہ یہ کلمات نہایت جامع ہیں اور ان کی حیثیت کلمات جامعات کی ہے۔ لیکن اس کے بعد جس چیز کا انکشاف انھوں نے کیا ہے اس سے ایک طرف تو اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان کے سینے میں ایک حساس دل تھا، دوسری طرف اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذہن و فکر کے لحاظ سے بھی نہایت باریک بیں تھے، وہ اپنی نازک ترین حسیات سے حق کو پہچان لیتے ہیں اور اس طرح جو چیز ان کے ہاتھ آتی ہے وہ محض کوئی منطقی چیز نہیں بلکہ اس سے آگے کی کوئی چیز

ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اُس مقام بلند پر ہیں جہاں آدمی حق کے بارے میں سوچتا نہیں حق سے دوچار اور اس سے لذت یاب ہوتا ہے۔ علامہؒ لکھتے ہیں:

"بَصَائِرُ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ هِيَ ثَلَاثُ كَلِمَاتٍ جَامِعَةٍ فَاِنَّ اَوَّلَ الْاَمْرِ الْعِلْمُ ثُمَّ السُّلُوْكُ بِحَسْبِهٖ ثُمَّ الْوُصُوْلُ اِلَى الْغَايَةِ۔"

مطلب یہ ہے کہ کامیابی کے لیے تین چیزیں لازمی ہیں، حقیقت کا صحیح علم آدمی کو حاصل ہو، اور اس علم کی روشنی میں وہ اپنے عمل اور زندگی کے رویہ کو درست کرے اور اس کے بعد اصل مقصد کا حصول۔ علامہ کا کہنا ہے کہ یہ تینوں بنیادی باتیں اس آیت میں بیان فرمادی گئی ہیں، بصائر کا تعلق علم کے شعبہ سے ہے۔ اور ہدیٰ کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اس علم کے مطابق اپنے علم کو صحیح رُخ دے اور اسی کے لحاظ سے زندگی کے میدانوں میں سرگرم عمل ہو۔ اور رحمت وہ غایت ہے جس تک پہنچنے کے لیے علم و عمل کے مرحلوں سے گزرنا ناگزیر ہے۔ غایت کا عنوان کتنا دلآویز ہے، یہ ہر صاحب دل شخص خود سمجھ سکتا ہے۔

مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں لیکن توضیح مدعا کے لیے یہ چند مثالیں کافی ہیں، ورنہ نور، امانت اور تسبیح وغیرہ قرآنی اصطلاحات پر علامہ نے جو علمی گفتگو کی ہے وہ نہایت بیش قیمت ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے وہ یہ کہ علامہ علیہ الرحمہ جذبات پر پورا قابو رکھتے ہیں، وہ دوسروں کی طرح جذبات میں بہہ جانے والے شخص ہرگز نہیں، نہ وہ کسی تجدد پسند شخص کی طرح حقائق سے گریز کرتے ہیں اور نہ وہ کسی شخصیت سے مرعوب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ احساس اور ہر فکر و نظر کو گہرائی سے پرکھتے اور اسے قرآن کی کسوٹی پر جانچتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ ایک چیز مَن کو بھا گئی اور اسے اختیار کرلیں خواہ وہ قرآن کے اپنے مزاج اور اس کی اپنی تصریحات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں ہم صرف دو ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

سورہ الانبیاء کی آیت ہے:

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۔ (الانبیاء-۱۰)

ہم نے تمھاری طرف ایک کتاب نازل کر دی ہے جس میں تمھارے لیے یاد دہانی ہے۔

'ذِکْرُکُمْ' کا ترجمہ "تمھارا ذکر" بھی کیا جاسکتا تھا۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"ہم نے اُتاری ہے تم کو کتاب کہ اس میں تمھارا نام ہے۔"

جذبات کو رہنما بنانے والوں کو یہی ترجمہ پسند آیا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ عالم دین نے "ذکرکم" کا مطلب "تمھارا ذکر" سمجھ کر اور اسے ایک وجد انگیز بات تصور کر کے ایک مفصّل مضمون لکھ ڈالا۔ یہ مضمون ایک مجلّہ کی خصوصی اشاعت (قرآن نمبر) میں نہایت اہتمام سے شامل کیا گیا تاکہ مسرت اور خوشی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک کیا جاسکے۔ لیکن علامہ فراہیؒ اس آیت قرآنی کے ساتھ اس ناروا سلوک کے روادار نہیں ہوئے۔ وہ قرآن کے اسلوب بیان اور اس کے مزاج کے رمز شناس تھے۔ پھر وہ محض ذاتی جذبات اور خواہشات پر قرآن کے وقار کو کیونکر قربان کرتے۔ لکھتے ہیں:

"ذِکْرُکُمْ اَیْ ذِکْرٌ لَکُمْ فَاِنْ لَمْ تُؤْمِنُوْا لَزِمَکُمْ وَعْدُ اللّٰہِ وَعَذَابُہٗ۔"

یعنی "اس میں تمھارے لیے نصیحت اور یاددہانی ہے۔ اگر تم ایمان نہیں لاتے تو تمھارے سلسلہ میں خدا کی دھمکی پوری ہو کر رہے گی، اور اس کا عذاب تم سے چمٹ کر رہے گا۔"

علامہؒ نے آیت کا جو مفہوم لیا ہے وہی سیاق و سباق سے مطابقت رکھتا ہے۔

جذبات میں بہنے والے لوگ اپنی نفسیاتی کمزوری کی وجہ سے اکثر عجوبہ پسند بھی ہوتے ہیں۔ اقبالؒ نے کہا ہے:

حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عین مستوری

علامہ عجوبہ پسند نہ تھے، وہ جلوۂ مستوری ہی کے شیدائی اور قدر شناس تھے۔ علامہ نے اپنے مطالعہ اور غور و فکر اور ژرف نگاہی سے اس حقیقت کو پالیا تھا کہ حقیقت کبھی دنیا میں بے نقاب نہیں ہوتی۔ یہ خصوصیت عالم آخرت ہی کو حاصل ہے کہ وہاں جلوۂ حق بے نقاب عیاں ہوگا۔ معجزات سے علامہ کو انکار نہیں لیکن ان کے نزدیک معجزات میں بھی پردہ داری

کی شان باقی رہنی ضروری ہے، اس لیے کہ یہ دنیا، عالم آخرت ہرگز نہیں ہے۔ ظاہری اسباب کو آڑ بنا کر خدا اپنے کمالات قدرت کا اظہار فرماتا، اپنے وفادار بندوں کی مدد کرتا اور دشمنانِ حق کی سرکوبی کرتا ہے۔ لیکن پردہ داری کی شان ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ" (سورہ الفیل) کا وہ مفہوم علامہ نہیں لیتے جو عام مفسّرین لیتے ہیں۔ قوم عاد و ثمود اور قوم لوطؑ وغیرہ کی تباہی کے سلسلہ میں خدا کی جو سنت ظاہر ہوئی ہے وہ ابرہہ اور اس کے لشکر کی تباہی کے سلسلہ میں کیوں بدل جائے گی؟ ظالم اقوام کو خدا نے قدرتی طاقتوں، باد و طوفاں، زلزلہ وغیرہ ہی کے ذریعہ سے تباہ کیا ہے۔ قرآن کا بیان اس سلسلہ میں بہت واضح ہے:

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلٰی قَوْمِہٖ مِنْ بَعْدِہٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا کُنَّا مُنْزِلِیْنَ۔ اِنْ کَانَتْ اِلَّا صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ھُمْ خٰمِدُوْنَ۝ (یٰسٓ ۔ ۲۸-۲۹)

اُس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اُتارا اور نہ ہمیں اُتارنا ہی تھا، وہ تو بس ایک سخت آواز تھی، تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بجھ کر رہ گئے۔

ثمود پر خدا نے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز تھی۔ اسی طرح عاد پر بھی رعد و برق والے بادل بھیجے گئے تھے۔

اور آخر میں ایک بات ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ علامہؒ کی حسّاس طبیعت یکے رُخی ہرگز نہ تھی کہ قرآن کے دیے ہوئے اصل پروگرام اور نصب العین سے وہ باخبر ہی رہتے، یا وہ اس کو نظرانداز کر کے گزر جاتے، اور ان کے فکر و فلسفہ میں اسے کوئی مقام حاصل نہ ہو سکتا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

"(خدا کی طرف سے حجت تمام ہونے کے بعد) خدا کی طرف سے حکم براءت، ہجرت اور جنگ کا اعلان اور انتقام کے تازیانے کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے ہیں۔ ظالم ہلاک ہوتے ہیں اور ان کی جگہ اہلِ ایمان خدا کی زمین پر قابض

ہوتے ہیں، یہی بعثت کی اصلی غرض ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ غلبۂ حق کو کوئی معمولی بات اور محض دنیوی چیز نہ سمجھو۔ غلبۂ حق ہی بعثت کی اصلی غرض و غایت ہے۔

ایک دوسری جگہ لکھا ہے:

"حق کا قیام اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ضروری قرار دیا ہے کیونکہ اس نے آسمانی بادشاہت کی بنیادیں اُسی حق پر قائم کی ہیں۔"

اس سلسلہ کی تفصیلات علاّمہ علیہ الرحمہ کی معروف کتاب "فی ملکوت اللہ" میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔